IQBAL REVIEW (67: 3)
(July – September 2026)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

اقبال کی اردو شاعری: فکری ارتقا، فنی امتیازات اور موضوعاتی تنوع

Iqbal's Urdu Poetry: Intellectual Evolution, Artistic Distinctions, and Thematic Diversity

ستار خٹک

ABSTRACT

This article presents a critical, thematic, and stylistic study of Allama Muhammad Iqbal's Urdu poetry as represented in his four major poetic collections: *Bang-e-Dara*, *Bal-e-Jibril*, *Zarb-e-Kalim*, and *Armaghan-e-Hijaz*. It traces the gradual development of Iqbal's poetic thought from his early engagement with conventional ghazal, romantic expression, patriotism, and nature poetry to his mature philosophical, spiritual, and civilizational concerns. The study shows that Iqbal transformed Urdu poetry into an effective medium for intellectual awakening, moral reconstruction, collective consciousness, and purposeful action. Special attention is given to the evolution of such central concepts as selfhood, love, struggle, spiritual freedom, Islamic universalism, the revival of the Muslim community, and the relationship between the individual and society. The article also examines Iqbal's critique of territorial nationalism, colonial domination, intellectual servitude, materialism, modern Western civilization, and passive interpretations of religion. It argues that Iqbal's poetry does not merely lament the decline of the Muslim world; rather, it offers a dynamic message of hope, renewal, self-

realization, and creative action. The study further highlights Iqbal's artistic innovations in both the ghazal and the poem. His distinctive vocabulary, powerful symbolism, philosophical imagery, musical expression, rhetorical force, and experimentation with poetic forms gave Urdu poetry a new intellectual and aesthetic direction. It concludes that Iqbal's Urdu poetry constitutes a coherent poetic vision in which philosophy, spirituality, history, politics, and artistic excellence are integrated into a comprehensive programme for the reconstruction of the individual, the Muslim community, and human civilization.

Keywords: Allama Muhammad Iqbal, Urdu Poetry, Intellectual Evolution, Poetic Artistry, Thematic Diversity, Philosophy of Selfhood, Muslim Ummah, Islamic Revival, Western Civilization, Creative Action

علامہ محمد اقبال اردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایسے عہد ساز شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے شعر کو محض جذبات و احساسات کے اظہار تک محدود رکھنے کے بجائے اسے فکری بیداری، روحانی تربیت، ملی شعور اور انقلابی عمل کا مؤثر وسیلہ بنایا۔ ان کی اردو شاعری بنیادی طور پر چار شعری مجموعوں ــــ بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ــــ پر مشتمل ہے، جن میں ان کے فکری و فنی ارتقا کے مختلف مراحل نمایاں ہوتے ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری کا آغاز روایتی غزل گوئی، فطرت نگاری اور حبِ وطن کے جذبات سے ہوا، لیکن وقت کے ساتھ ان کی فکر ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال، فلسفۂ خودی، عشق، فقر، حرکت و عمل، اسلامی اخوت، مغربی تہذیب کی تنقید اور انسان کے مقامِ نیابتِ الٰہی جیسے ہمہ گیر موضوعات کا احاطہ کرنے لگی۔ اقبال نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے نظم، غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، مکالمہ اور دوسری شعری ہیئتوں کو نہایت کامیابی سے برتا اور اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئی تراکیب، تازہ استعارات اور توانا اسلوبِ بیان سے مالا مال کیا۔ زیرِ نظر مقالے میں اقبال کے چاروں اردو شعری مجموعوں کا فکری، فنی اور موضوعاتی جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری کے تدریجی ارتقا، امتیازی خصوصیات اور اردو ادب پر اس کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔

بانگِ درا

بانگِ درا کی اشاعت اور انتخابِ کلام

اقبال کا پہلا اردو مجموعۂ کلام بانگِ درا ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اس وقت تک کے ان کے اردو کلام کا ایک منتخب حصہ شامل کیا گیا تھا۔ اسے محض مجموعۂ کلام کے بجائے انتخاب کہنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اقبال نے اپنا بہت سا ابتدائی کلام اس میں شامل نہیں کیا۔ سیالکوٹ اور لاہور کے مشاعروں کے لیے لکھی ہوئی سینکڑوں غزلیں انہوں نے مکمل طور پر خارج کر دیں۔ رسائل میں شائع ہونے والی نظموں اور غزلوں میں بھی بڑے پیمانے پر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ بعض نظموں کو بالکل رد کر دیا گیا، بعض طویل نظموں کا صرف ایک آدھ بند باقی رکھا گیا اور متعدد نظموں اور غزلوں سے کئی اشعار حذف کر دیے گئے۔[1]

اقبال نے بعض اشعار میں ایسی لفظی تبدیلیاں بھی کیں جن سے ان کے مفہوم اور معنویت میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ یہ ردوبدل اس قدر وسیع تھا کہ کئی ایسے اشعار بھی بانگِ درا میں جگہ نہ پا سکے جو اس وقت تک خاصے مشہور ہو چکے تھے۔[2] مثال کے طور پر طویل نظم ''فریادِ اُمت'' کا صرف ایک بند ''دل'' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل کیا گیا، جب کہ وہ بند حذف کر دیا گیا جس میں یہ معروف شعر موجود تھا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں[3]

اس وسیع تر انتخاب، ترمیم اور تنسیخ سے اقبال کی غیر معمولی فنی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عموماً شعرا کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے، مگر اقبال نے اپنے کلام کے انتخاب میں شخصی وابستگی کے بجائے فکری معنویت، فنی معیار اور مجموعی شعری مقصد کو ترجیح دی۔

بانگِ درا کی زمانی تقسیم

بانگِ درا کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک محیط ہے، جب کہ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے کتاب کی اشاعت، یعنی ۱۹۲۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر دور میں پہلے نظمیں اور آخر میں غزلیں درج کی گئی ہیں۔

بعض نظموں کے ساتھ سالِ تخلیق بھی درج ہے، مگر بیشتر نظموں کے لیے یہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود مجموعے میں عمومی طور پر زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے؛ یعنی پہلے لکھی جانے والی نظم پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی نظم اس کے بعد رکھی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں "ظریفانہ" کے عنوان سے بعض قطعات اور مزاحیہ اشعار شامل ہیں جو اکبر الٰہ آبادی کی پیروی میں لکھے گئے تھے۔ ان اشعار کے ساتھ سالِ تحریر درج نہیں، تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں تخلیق کیے گئے۔

شیخ عبدالقادر کا دیباچہ

بانگِ درا کے آغاز میں سر شیخ عبدالقادر کا ایک مبسوط دیباچہ شامل ہے۔ شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور خود بھی دنیائے ادب میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ ان کا یہ دیباچہ اردو کے کسی شعری مجموعے پر لکھے گئے معروف ترین دیباچوں میں شمار ہوتا ہے۔

بعد کے ادوار میں اقبالیات کے بیشتر محققین اور نقادوں نے اس دیباچے کو ایک بنیادی حوالہ بنایا۔ اس دیباچے کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس کے مصنف اقبال کے قریبی دوست تھے، بلکہ اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اقبال کی فکری و شاعرانہ شخصیت کے ارتقا کو قریب سے دیکھا تھا۔

بانگِ درا کے تینوں ادوار کی شاعری موضوعات کی رنگارنگی اور اسالیبِ بیان کے تنوع کی بنا پر پوری اردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اپنی متعدد خصوصیات کے لحاظ سے یہ ادوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تاہم ان سب میں ایک بنیادی فکری وحدت اور نقطۂ نظر کی یکسانیت بھی موجود ہے۔

بانگِ درا کا پہلا دور

غزل گوئی سے شاعری کا آغاز

علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء تک اردو میں جو کچھ لکھا، اس کا انتخاب بانگِ درا کے پہلے دور میں شامل کیا گیا ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا کی طرح اقبال نے بھی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ ابتدائی زمانے میں وہ سیالکوٹ اور لاہور کے مشاعروں میں اپنی غزلیں پیش کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ہندوستان میں داغ دہلوی، امیر مینائی اور ان کے شاگردوں کی شاعری مقبول تھی۔ جو نوجوان شاعر غزل کہنا شروع کرتا، وہ عموماً اسی رنگ میں رنگ جاتا۔ اس طرزِ شاعری

میں عشقِ مجازی کے مضامین کی کثرت تھی۔ اسی زمانے میں "معاملہ بندی" کا وہ انداز بھی رائج تھا جو اس سے پہلے جرأت اور مومن جیسے شعرا کی بدولت مقبول ہو چکا تھا۔

داغ دہلوی اور ان کے شاگردوں کی شاعری میں معاملہ بندی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ داغ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے امیر مینائی اور ان کے تلامذہ نے بھی یہی رنگ اختیار کیا۔ عشقیہ مضامین کے ساتھ اس دبستان کے شعرا زبان، محاورے اور روزمرہ کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔

لاہور میں بھی اس زمانے میں داغ اور امیر مینائی کے متعدد تلامذہ موجود تھے۔ ان میں ارشد گورگانی اور ناظم لکھنوی کے نام زیادہ معروف ہوئے۔ اقبال نے سیالکوٹ ہی میں خط و کتابت کے ذریعے داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور اپنی غزلیں اصلاح کے لیے انہیں بھیجنے لگے۔ تاہم داغ نے جلد ہی یہ کہہ دیا کہ اقبال کے کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔

نظم گوئی کی طرف رجحان

غزل گوئی کے ساتھ ساتھ اقبال نے انگریزی شعرا سے متاثر ہو کر کئی نظمیں بھی لکھیں۔ بانگِ درا کے پہلے دور میں شامل متعدد نظموں کو اقبال نے خود انگریزی شعرا کی نظموں سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ روایتی اردو غزل، ہندوستانی شعری ماحول اور انگریزی شاعری کے اثرات نے مل کر انہیں نظم گوئی کی طرف مائل کیا۔

اقبال کی ابتدائی نظموں کے موضوعات بظاہر وہی ہیں جو اس عہد کے دوسرے نظم نگاروں کے ہاں ملتے ہیں، مگر ان کے کلام میں تفکر، معنویت اور داخلی گہرائی کی ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو ان کے معاصر شعرا کے ہاں کم دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی حالات اور وطنی شاعری

انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان میں سیاسی جماعتوں کا قیام عمل میں آنے لگا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ سیاسی تحریکیں بھی ابھرنے لگیں اور لوگوں کے دلوں میں آزادی کی خواہش پیدا ہوئی۔ تاہم اس زمانے میں برطانوی حکومت اس قدر طاقت ور تھی کہ لوگ کھلم کھلا آزادی کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انگریزی استعمار کی مخالفت کے لیے بالواسطہ طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔

ان طریقوں میں اپنے وطن کے قدرتی مناظر کو موضوع بنا کر ملک سے محبت پیدا کرنا، ماضی کی تاریخ سے ایسے واقعات منتخب کرنا جن سے قومی عظمت ظاہر ہو، مشرقی تہذیب و تمدن کی برتری ثابت کرنا اور ہندوستان میں آباد مختلف قوموں کو باہمی محبت اور اتحاد کی تلقین کرنا شامل تھا۔

اس طرح کی شاعری بیسویں صدی کے آغاز میں خاصی مقبول ہوئی اور تنقیدی کتب میں اسے ''وطنی شاعری'' کا رجحان قرار دیا گیا۔ اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری کا سب سے نمایاں موضوع بھی حبِ وطن ہے۔ ''ترانۂ ہندی''، ''تصویرِ درد''، ''نیا شوالہ''، ''صدائے درد'' اور ''ہندوستانی بچوں کا گیت''، جیسی نظمیں اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

اس زمانے میں اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ تاہم بعد کے سیاسی و سماجی تجربات نے انھیں اس نتیجے تک پہنچایا کہ دونوں قوموں کے درمیان حقیقی اور مستقل اشتراک ممکن نہیں۔

فطرت نگاری

اقبال کے ابتدائی کلام کا دوسرا بڑا رجحان مناظرِ فطرت کی تصویر کشی ہے۔ ''ہمالہ''، ''ابرِ کوہسار''، ''ایک آرزو''، ''ماہِ نو''، ''جگنو''، ''ابر'' اور ''کنارِ راوی'' اسی نوع کی نظمیں ہیں۔

فطرت سے اقبال کا یہ تعلق آخر عمر تک برقرار رہا، اگرچہ بعد کے کلام میں فطرت نگاری کی وہ کثرت باقی نہ رہی جو ابتدائی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبال نے مناظرِ فطرت کو انسانی زندگی کے پس منظر میں غیر معمولی اہمیت دی۔

انگریزی کے رومانی شعرا میں فطرت کے متعلق دو بنیادی نظریات پائے جاتے ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ مناظرِ فطرت اپنی ذات میں حسین ہیں اور جو شخص فطرت کے قریب ہو جائے، اس کے دکھ درد کم ہو جاتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق فطرت انسانی زندگی کے لیے سکون اور اطمینان کا سرچشمہ ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مناظرِ فطرت بذاتِ خود کسی مخصوص کیفیت کے حامل نہیں، بلکہ انسان اپنی داخلی کیفیت ان پر منعکس کرتا ہے۔ چنانچہ غم زدہ شخص فطرت میں اداسی محسوس کرتا ہے، جب کہ خوش باش شخص انھی مناظر سے مسرت حاصل کرتا ہے۔

اقبال پہلے نظریے سے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مناظرِ فطرت کو انسان کے لیے سکون بخش، پاکیزگی پیدا کرنے والا اور روحانی آسودگی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ نظم ''ایک آرزو'' کا آغاز اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے:

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے مِرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خاموشی پہ یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو[۴]

جدوجہد اور خودی کے ابتدائی نقوش

اقبال کے پہلے دور کے کلام میں بعض ایسے موضوعات کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں جو بعد میں ان کی شاعری کے مرکزی مباحث بن گئے۔ نظریۂ خودی پیش کرتے ہوئے اقبال نے کشمکش، حرکت، جدوجہد اور پیکارِ حیات کو بنیادی اہمیت دی۔ اگرچہ خودی کا باقاعدہ اور مکمل تصور بانگِ درا کے تیسرے حصے میں سامنے آتا ہے، تاہم پہلے دور میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جن میں کوشش اور جدوجہد کی معنویت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ نظم ''آفتابِ صبح'' کا یہ شعر اسی تصور کا نمائندہ ہے:

کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطف صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے[۵]

یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جدوجہد کا مقصد ہمیشہ فوری یا ظاہری کامیابی نہیں ہوتا، بلکہ خود کوشش اور مشکلات پر قابو پانے کی سعی بھی انسانی زندگی کو معنویت اور لذت عطا کرتی ہے۔

ملتِ اسلامیہ اور عہدِ رسالت سے وابستگی

اقبال کے پہلے دور کی شاعری ملتِ اسلامیہ کے احساس سے بھی یکسر خالی نہیں۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا عہد ان کے لیے غیر معمولی کشش رکھتا تھا۔ نظم ''بلال'' میں عہدِ رسالت سے ان کی قلبی وابستگی اور اسلامی تاریخ کے مثالی دور سے گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ رجحان بعد میں وسعت اختیار کر کے اقبال کی شاعری کا بنیادی حوالہ بن گیا۔ ابتدائی دور میں جو احساس ایک جذباتی اور تاریخی وابستگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، وہ بعد کے کلام میں ملت کے احیا، اسلامی معاشرت کی تشکیل اور عہدِ نبوی کے اصولوں کی طرف واپسی کی منظم دعوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بانگِ درا کا دوسرا دور

قیامِ یورپ اور رومانی نظمیں

جب اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو ان کی توجہ شاعری کی طرف نسبتاً کم ہو گئی۔ اس کے باوجود بانگِ درا کے دوسرے دور میں شامل نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کی چند اہم رومانی نظمیں اسی زمانے میں لکھی گئیں۔

یہ دور ان کی فکری تشکیل کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ یورپ میں قیام کے دوران انھوں نے مغربی فلسفے، تہذیب، سیاست اور معاشرت کا قریب سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعے نے ان کے ذہن میں مغربی تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو واضح کیا اور بعد کی شاعری میں مغرب پر ان کی تنقید کے لیے فکری بنیاد فراہم کی۔

ملتِ اسلامیہ سے براہِ راست خطاب

دوسرے دور کی متعدد نظموں میں خطاب خاص طور پر مسلمانوں سے کیا گیا ہے۔ ”طلبہ علی گڑھ کالج کے نام“، ”عبدالقادر کے نام“ اور ”صقلیہ“ اسی نوع کی نظمیں ہیں۔

نظم ”صقلیہ“ مسلمانوں کے تاریخی زوال کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔ انگلستان سے واپسی کے سفر میں جب اقبال کا جہاز جزیرۂ سسلی کے قریب سے گزرا تو انھیں وہ زمانہ یاد آیا جب یہ خطہ اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس تاریخی احساس کو انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا:

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا[۶]

یہ شعر محض ماضی کی عظمت کا نوحہ نہیں بلکہ حال کی زبوں حالی پر ایک گہرا فکری اور جذباتی ردعمل بھی ہے۔

شیخ عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ قیامِ یورپ کے دوران اقبال نے ایک مرتبہ شاعری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری میں صرف ہونے والا وقت کسی دوسرے زیادہ مفید کام میں صرف کیا جائے۔ تاہم شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے سمجھانے پر انہوں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔

غالباً اسی مرحلے پر اقبال نے یہ طے کیا کہ شاعری کو محض ذاتی جذبات یا جمالیاتی اظہار کا ذریعہ بنانے کے بجائے ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور رہنمائی کے لیے وقف کیا جائے۔ "عبدالقادر کے نام" میں اسی پختہ عزم کا اظہار ہوا ہے۔ نظم کا پہلا شعر ہے:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں[۷]

یہی وہ تصور ہے جسے اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد پوری قوت اور یقین کے ساتھ بار بار پیش کیا۔ ان کی شاعری اب محض حسن و عشق کی ترجمان نہیں رہی بلکہ ملت کی تاریکیوں میں فکری روشنی پیدا کرنے کا وسیلہ بن گئی۔

فلسفیانہ موضوعات کی ابتدا

اس دور کی بعض نظموں میں وہ فلسفیانہ رجحانات بھی نمایاں ہونے لگے جو بعد میں اقبال کے مستقل موضوعات بن گئے۔ "محبت"، "چاند اور تارے"، "کوششِ ناتمام"، "پیامِ عشق" اور "انسان" اسی نوع کی نظمیں ہیں۔

ان نظموں میں زندگی کو مسلسل حرکت، کوشش اور تخلیقی عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرد کی حقیقی زندگی اس کی جدوجہد میں اور قوم کی اصل ہستی افراد کے باہمی ربط میں قرار پاتی ہے:

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ نا تمام سے[۸]

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا[۹]

پہلے شعر میں زندگی کو مسلسل اور ناتمام کوشش سے وابستہ کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے شعر میں فرد کی انفرادی ہستی کے مقابلے میں ملت کی اجتماعی زندگی کو حقیقی اور پائیدار قرار دیا گیا ہے۔

بانگِ درا کا تیسرا دور

اقبال کے نظامِ فکر کی تکمیل

بانگِ درا کی بیشتر نظمیں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیانی عرصے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں بعض نظمیں اقبال کے فارسی مجموعوں **اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق** کی اشاعت سے پہلے لکھی گئیں، جب کہ باقی نظمیں فارسی شاعری کے متوازی تخلیق ہوئیں۔

فارسی کلام میں اقبال کا نظامِ فکر نسبتاً مربوط، مفصل اور مکمل صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ اسی لیے ان کی اردو شاعری میں بھی انہی افکار کے مختلف پہلو پیش کیے گئے۔ اردو کلام میں ان نظریات کی وہ تفصیل موجود نہیں جو فارسی مثنویوں میں ملتی ہے، لیکن اختصار، رمزیت اور شعری تاثیر کے ساتھ وہی بنیادی تصورات اردو نظموں اور غزلوں میں بھی جلوہ گر ہیں۔

نظریۂ خودی، عشق اور ملت

اقبال نے مثنوی **اسرارِ خودی** میں خودی کے ارتقا کے لیے عشق، نصب العین اور مقصد سے بے پناہ وابستگی کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا خودی کے لیے زہرِ قاتل ہے، کیونکہ خودی کی قوت آزادی، خوداعتمادی، جدوجہد اور تخلیقی عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

رموزِ بیخودی میں افراد کو تلقین کی گئی ہے کہ ملت کے زوال اور ادبار کے زمانے میں اجتماعی زندگی سے وابستہ رہیں اور اپنی تمام صلاحیتیں ملت کی بہبود کے لیے وقف کر دیں۔ ملت کے مرکز سے وابستگی، آئین کی پابندی، شخصی مفادات سے بالاتری اور اجتماعی مقصد کے لیے ایثار کو قومی بقا کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

یہی تصورات بانگِ درا کے تیسرے دور کی مختلف نظموں میں متنوع اسالیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاران کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے[10]

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ[11]

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ[12]

ان اشعار میں زندہ تمنا، ملت سے وابستگی اور عشق کی عملی قوت کو فرد اور قوم کی بیداری کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔

وطنیت اور تصورِ ملت

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے ذیلی موضوعات کے علاوہ بعض ایسے مسائل بھی ہیں جن پر اقبال نے اردو شاعری میں نسبتاً زیادہ وضاحت سے اظہارِ خیال کیا۔ ان میں سب سے نمایاں موضوع ''وطنیت'' ہے۔

ابتدائی زمانے میں اقبال ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کے سیاسی اور تاریخی شعور نے انہیں یہ احساس دلایا کہ ایسا اتحاد مستقل بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہندو قیادت اور برطانوی سامراج جس قومیت کے تصور کو فروغ دے رہے تھے، اس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ ایک ہی ملک میں رہنے والی تمام قومیں اپنی مذہبی، تہذیبی اور تاریخی شناخت ختم کر کے ایک قوم بن جائیں۔

اقبال کے نزدیک یہ سیاسی نظریہ مغرب کی لادینی اور جغرافیائی وطنیت سے ماخوذ تھا، جب کہ اسلامی قومیت وطن، رنگ، نسل اور زبان کی حدود سے بالاتر ہے۔ اسلامی تاریخ کے آغاز ہی میں یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اہلِ مکہ کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا تو بعض لوگوں نے اسے قبول کیا اور بعض نے مخالفت کی۔ مسلمان اور کفار ایک ہی نسل، ایک ہی

علاقے اور ایک ہی زبان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن عقیدے کے اختلاف نے انہیں دو الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت صرف علاقے، زبان یا نسل کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتی۔ حضرت سلمان فارسی اور حضرت بلال حبشی مختلف علاقوں، زبانوں اور نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اسلامی برادری میں ان کا مقام دوسرے صحابۂ کرام کی طرح معزز تھا۔

اقبال نے ۱۹۰۴ء میں "قومی زندگی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں اقوامِ عالم کا تجزیہ کرتے ہوئے ملتِ مسلمہ کو خیر الامم قرار دیا۔ ان تصورات کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام علاقائی وطنیت کے بجائے عقیدے کی بنیاد پر ملت کا تصور پیش کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے مختلف خطوں میں آباد مسلمان ایک ہی عالمگیر اسلامی برادری کے ارکان ہیں۔

اقبال نے "بلادِ اسلامیہ"، "وطنیت"، "ترانۂ ملی" اور "مذہب" جیسی نظموں میں اس نظریے کو واضح کیا۔ اسی فکری ارتقا کے نتیجے میں وہ "ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کے تصور سے آگے بڑھ کر "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" تک پہنچے۔

زوالِ ملت اور امیدِ نو

بانگِ درا کے آخری حصے میں ملتِ اسلامیہ کے زوال کا عبرت ناک نقشہ بھی متعدد نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تقریباً تمام مسلم ممالک سامراجی طاقتوں کے زیرِ تسلط تھے۔ باہمی اختلافات، بے عملی، فرقہ واریت اور مغرب کے بعض باطل نظریات کو قبول کرنے کے باعث مسلمانوں کی ملی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔

"غرۂ شوال"، "ہلالِ عید"، "شمع اور شاعر"، "شکوہ"، "جوابِ شکوہ" اور "خطاب بہ جوانانِ اسلام" جیسی نظموں میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

تاہم ان نامساعد حالات کے باوجود اقبال کی شاعری مجموعی طور پر قنوطیت کے بجائے رجائیت کی حامل ہے۔ وہ اپنے زمانے کی صورتِ حال سے غیر مطمئن ضرور تھے، لیکن مایوس نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ملتِ اسلامیہ خدا کے آخری پیغام کی امین ہے، اس لیے اس کا مکمل طور پر مٹ جانا ممکن نہیں۔ انہیں کامل اعتماد تھا کہ یہ ملت دوبارہ بیدار ہو گی اور دنیا میں اپنا تاریخی کردار ادا کرے گی:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا[۱۳]

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے[۱۴]

ان اشعار میں اقبال کا تاریخی شعور، ملت کی مخفی صلاحیتوں پر اعتماد اور مستقبل کے احیا کی امید پوری قوت سے ظاہر ہوتی ہے۔

اقبال کی غزل گوئی

بانگِ درا کی شاعری سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اقبال جتنے بڑے نظم نگار ہیں، اتنے ہی اہم غزل گو بھی ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں ان کا بنیادی اسلوب، طرزِ فکر اور اندازِ بیان یکساں ہے۔ اقبال کا مخصوص جذبہ اور تخیل ان کے منفرد افکار اور احساسات سے پیدا ہوتا ہے اور دونوں اصناف میں اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

بانگِ درا میں غزلوں کی تعداد نظموں کے مقابلے میں کم ہے، لیکن طرزِ فکر اور اسلوبِ سخن کے اعتبار سے یہ غزلیں اسی اقبال کی نمائندگی کرتی ہیں جس کی نظم نگاری کو اردو شاعری کا ایک بلند ترین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں غزل کا مقام شیکسپیئر کی شاعری میں سانٹ کے مقام سے بھی بلند تر ہے۔ شیکسپیئر کے مجموعی نظامِ فن میں سانٹ کی حیثیت بڑی حد تک ایک ضمیمے کی سی ہے، لیکن اقبال کے شعری نظام میں غزل ایک بنیادی جزوِ ترکیبی ہے۔ ان کی نظموں میں جو موضوعات وسعت اور تشریح کے ساتھ سامنے آئے ہیں، وہی غزلوں میں اختصار، ایجاز اور نغمگی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

اقبال کی غزل بھی عصری سیاست، تہذیبی کشمکش اور ملی مسائل سے اسی طرح متاثر ہے جس طرح ان کی نظم۔ دوسری طرف ان کی نظم میں بھی وہی نغمگی، موسیقیت اور جذباتی تاثیر موجود ہے جو غزل کی جان سمجھی جاتی ہے۔ یہ رنگ و آہنگ اقبال کے تمام اردو شعری مجموعوں میں نہ صرف قائم رہا بلکہ مسلسل نکھرتا گیا۔

بالِ جبریل

تعارف اور زمانۂ اشاعت

بالِ جبریل علامہ اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے، جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ بانگِ درا اور بالِ جبریل کی اشاعت کے درمیان تقریباً بارہ سال کا وقفہ ہے۔ اس عرصے میں اقبال کا کوئی نیا اردو مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا، البتہ ان کے دو فارسی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔

بالِ جبریل میں وہ اردو کلام شامل ہے جو اقبال نے بانگِ درا کی تکمیل کے بعد اور بالِ جبریل کی اشاعت تک تخلیق کیا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب نہایت اہم ہے، کیونکہ اقبال کے فارسی کلام میں جو افکار وضاحت اور تفصیل سے پیش ہوئے، وہ بالِ جبریل میں رمز، اشارے، اختصار اور شعری تاثیر کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

کتاب کی داخلی ترتیب

بالِ جبریل کا پہلا حصہ غزلیات اور دوسرا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ فنی اعتبار سے دونوں حصے اقبال کی شاعری میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک افکار و خیالات کا تعلق ہے، ان نظموں اور غزلوں میں بنیادی طور پر وہی نظریات بیان ہوئے ہیں جو اقبال کی فارسی کتابوں اور بانگِ درا کے تیسرے دور کی بعض نظموں میں ملتے ہیں۔

تاہم بالِ جبریل میں غزل گوئی اور نظم نگاری کے جو فنی تجربات سامنے آئے، وہ اردو شاعری کی تاریخ میں معجزاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے اس مجموعے میں اردو غزل اور نظم دونوں کو موضوع، ہیئت، زبان، علامت، صوتی آہنگ اور فکری وسعت کے نئے امکانات سے آشنا کیا۔

بالِ جبریل کی ابتدائی غزلیں

بالِ جبریل کے غزلیہ حصے کی پہلی سولہ غزلیں باقی غزلوں سے الگ رکھی گئی ہیں۔ اس کی غالب وجہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر مابعد الطبیعاتی موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ خدا، کائنات اور انسان کے باہمی تعلق، وجود کی حقیقت، انسانی ارادے اور روحانی تجربے جیسے مسائل ان غزلوں کا بنیادی موضوع ہیں۔ ان کے بعض اشعار اپنی فلسفیانہ گہرائی کے باعث خاصے دقیق بھی ہیں۔

ان غزلوں کے بعد حکیم سنائی کی زمین میں ایک قصیدہ نما غزل شامل ہے۔ حکیم سنائی فارسی کے اہم صوفی شاعر تھے اور مولانا روم نے بھی ان کے فکری و شعری اثرات قبول کیے۔ اس قصیدہ نما غزل کے بعد بالِ جبریل کی غزلیات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

غزلیات کے بنیادی موضوعات

بالِ جبریل کی غزلوں میں خودی، عشق، کشمکش حیات، فقر، وجدان اور عقل کا تقابل، اصل اسلام کی طرف واپسی اور اسلامی فکر میں شامل کیے گئے غیر اسلامی عناصر کے اخراج جیسے موضوعات بار بار سامنے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ صوفی اور ملا کی بے عملی، مشرق پر مغرب کے ہلاکت خیز اثرات، مغربی نظامِ تعلیم کی خامیاں، تہذیبی غلامی، ملتِ اسلامیہ کا زوال، مردِ مومن کی صفات اور تخلیقی عمل کی ضرورت بھی زور دار اشعار میں بیان ہوئی ہے۔

اس فکری تسلسل کے باوجود بالِ جبریل کی غزلیات اردو غزل کی تاریخ میں ایک بالکل نئی آواز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا اندازِ بیان، ذخیرۂ الفاظ، تشبیہات، استعارات، شعری تصویریں، بحریں، زمینیں اور تراکیب سابقہ اردو غزل سے مختلف ہیں۔ اقبال نے نہ صرف غزل کے موضوعات کو بدل دیا بلکہ اس کی زبان، فضا اور داخلی ساخت کو بھی نئی صورت عطا کی۔ یوں انہوں نے غزل کے ظاہر اور باطن، دونوں میں انقلاب برپا کر دیا۔

جدید اردو غزل پر اثرات

بالِ جبریل کی غزل گوئی صنفِ غزل میں ایک ایسا نیا تجربہ تھی جس نے بعد کے جدید غزل گو شعرا کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ جدید اردو غزل میں موضوع، زبان، علامت، استعارے اور ہیئت کے جو متنوع تجربات دکھائی دیتے ہیں، ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق بالِ جبریل کی غزلیات سے قائم ہوتا ہے۔

یہ غزلیں اپنی نکتہ آفرینی، فکری تازگی، موسیقیت اور اندازِ بیان کی دلکشی سے قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اُس کا
صفائے پاکیِ طینت سے ہے گہر کا وضو[۱۵]

تِری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ[۱۶]

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں[۱۷]

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلا ہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند[۱۸]

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر[۱۹]

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا اِلٰہ اِلا
لغتِ غریب جب تک ترا دِل نہ دے گواہی[۲۰]

غزل کا یہ انداز اردو غزل کی تاریخ میں یقیناً نیا تھا۔ ابتدا میں قاری کو اس کی زبان، علامتوں اور تراکیب میں قدرے غرابت محسوس ہو سکتی ہے، لیکن جب وہ اس اسلوب سے آشنا ہو جاتا ہے تو اس پر فکر و معنی کی ایک نئی دنیا منکشف ہوتی ہے۔

اقبال کی فکری پختگی

بالِ جبریل کی غزلیات اقبال کی غزل گوئی کے چوتھے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت تک ان کی فکری حیثیت پوری طرح متعین ہو چکی تھی اور وہ اپنے فلسفے کے مخصوص نتائج تک پہنچ چکے تھے۔ اس لیے اس دور کے کلام میں فکر کی وضاحت کے ساتھ اعتماد، جوش، یقین اور بلند آہنگی بھی نمایاں ہے۔

اقبال جدید اردو غزل کے اہم ترین پیش رو اور امام قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کی غزل کی زبان دوسرے اردو شعرا سے مختلف ہے۔ انہوں نے غزل میں ایک نیا پیغام پیش کیا اور اس پیغام کے اظہار کے لیے نئی تراکیب، علامتیں اور استعارات وضع کیے۔

اقبال نے اپنی غزل میں نطشے، برگساں، رومی، مارکس، گوئٹے اور ملٹن جیسے مفکرین اور شعرا کے خیالات کی ترجمانی بھی کی اور ان پر تنقید بھی۔ ان کی غزل میں پہلی مرتبہ قوموں کے عروج و زوال، تاریخِ اسلام، بین الاقوامی حالات اور مشرق و مغرب کے تہذیبی مسائل اس وسعت اور قوت کے ساتھ بیان ہوئے۔

بالِ جبریل کا آغاز غزلیات سے ہوتا ہے اور ان کا سلسلہ چھہتر غزلوں تک جاری رہتا ہے۔ اقبال نے اپنے اردو کلام کے اس دوسرے مجموعے میں غزل کو پہلے سے زیادہ اہمیت دی اور اس صنف پر خصوصی توجہ صرف کی۔

غزل کا فنی و اسلوبی امتیاز

بالِ جبریل کی غزلیات تخلص کے روایتی تکلف سے بڑی حد تک خالی ہیں اور ان میں زبورِ عجم کی غزلیات سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ توانا، موسیقیت سے بھرپور اور سوز و گداز کا حامل ہے۔

فارسی تراکیب کا بامحاورہ اور خوب صورت استعمال اقبال کی قادرالکلامی کا واضح ثبوت ہے۔ خوب صورت تشبیہات، تازہ استعارات اور بلیغ علامات ان کی غزل کی جان ہیں۔ بالِ جبریل کی غزلیں تغزل میں رچی بسی ہیں اور رمز و ایما ان کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔

اگرچہ ان غزلوں میں فلسفیانہ گہرائی موجود ہے، تاہم یہ محض مبہم یا ناقابلِ فہم شاعری نہیں۔ اقبال نے حیات و موت، وجود، خودی، عشق، عقل، تاریخ اور تہذیب کے پیچیدہ مسائل کو شعری بلاغت کے ساتھ پیش کیا۔ روانی، سلاست، طنز، شگفتگی، ندرتِ بیان اور بلاغت بالِ جبریل کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

بالِ جبریل کی طویل نظمیں

بالِ جبریل کی بیشتر نظمیں مختصر ہیں، تاہم اس میں شامل تین طویل نظمیں — ذوق و شوق، مسجدِ قرطبہ اور ساقی نامہ — ایسے عظیم شعری کارنامے ہیں جن پر دنیا کی کوئی بھی ترقی یافتہ زبان فخر کر سکتی ہے۔

نقادوں کے درمیان شاید کبھی یہ فیصلہ نہ ہو سکے کہ ان تینوں میں سب سے بہترین نظم کون سی ہے، لیکن اس بات پر بڑی حد تک اتفاق پایا جاتا ہے کہ خود اقبال نے بھی ان سے بہتر نظمیں کم ہی لکھی ہیں۔

''ذوق و شوق'' ایک بے مثال نعتیہ نظم ہے۔ ''مسجدِ قرطبہ'' اور ''ساقی نامہ'' میں اقبال کے بنیادی فلسفیانہ، روحانی اور ملی نظریات کا خلاصہ موجود ہے۔ تینوں نظموں میں خلوصِ جذبہ، موضوع اور اندازِ بیان کی ہم آہنگی، زورِ بیان، موسیقیت اور داخلی ربط اپنی انتہائی بلند سطح پر نظر آتے ہیں۔

مختصر نظمیں اور مکالماتی اسلوب

بالِ جبریل کی مختصر نظموں میں ''طارق کی دعا''، ''الارض للہ''، ''لالۂ صحرا''، ''زمانہ'' اور ''شاہین'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعے کے آخری حصے میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں خیالات کا اظہار نسبتاً براہِ راست انداز میں کیا گیا ہے۔ ''آزادیِ افکار''، ''یورپ''، ''سنیما'' اور ''فقر'' اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ اس براہِ راست اور کاٹ دار اسلوب کو اقبال نے بعد میں ضربِ کلیم میں مزید نکھارا۔

''جبریل و ابلیس'' کا مکالمہ بھی بالِ جبریل میں شامل ہے۔ ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں''، ''جاوید کے نام''، ''یورپ سے ایک خط''، ''نپولین کے مزار پر''، ''مسولینی''، ''نادر شاہ افغان''، ''خوشحال خاں کی وصیت''، ''تاتاری کا خواب''، ''ابوالعلا معری''، ''پنجاب کے پیرزادوں سے''، ''ہارون کی آخری وصیت'' اور ''ابلیس کی عرضداشت'' بھی اسی مجموعے کی اہم نظمیں ہیں۔ ان تمام منظومات میں اقبال کی فکری محنت، قلبی اضطراب اور خونِ جگر شامل ہے۔

ضربِ کلیم

اشاعت اور معنویتِ عنوان

ضربِ کلیم علامہ اقبال کا تیسرا اردو شعری مجموعہ ہے، جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں اور ان کے درمیان اقبال کی کوئی فارسی کتاب حائل نہیں ہوئی۔

ضربِ کلیم کی تمام نظمیں ایک خاص، براہِ راست، مختصر اور بلند آہنگ اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی قوتوں پر اپنی ضربِ کلیمی سے کاری ضرب لگائی، اسی طرح اقبال اس مجموعے کے ذریعے دورِ حاضر کی فرعونی اور انسان دشمن طاقتوں کو چیلنج کرنا چاہتے ہیں۔

اسی بنا پر انھوں نے ضربِ کلیم کو "دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ" قرار دیا۔ "دورِ حاضر" اقبال کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، جس سے مراد محض موجودہ زمانہ نہیں بلکہ وہ مادی، سرمایہ دارانہ، استعماری اور لادینی تہذیبی نظام ہے جس نے انسان کو اخلاقی اور روحانی زوال سے دوچار کر دیا۔

تہذیبِ حاضر پر تنقید

اقبال کے نزدیک مغرب نے اپنے افکار، سیاسی نظام، معاشی نظریات اور تہذیبی اقدار کے ذریعے دنیا میں ایسی گمراہیاں پھیلائیں جن کے نتیجے میں انسان بظاہر آزاد مگر باطن میں غلام ہو گیا۔ اس کیفیت کو وہ بالِ جبریل میں یوں بیان کر چکے تھے:

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری[۲۱]

ضربِ کلیم میں تہذیبِ حاضر کی اسی انسان دشمنی کو تفصیل کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔ اقبال جدید تہذیب کی ظاہری چمک دمک کے پس پردہ موجود روحانی خلا، اخلاقی انحطاط، معاشی استحصال، سیاسی غلامی اور فکری بے سمتی کو بے نقاب کرتے ہیں۔

ضربِ کلیم کی موضوعاتی ترتیب

کتاب کے پہلے حصے میں "اسلام اور مسلمان" کے زیرِ عنوان متفرق نظمیں شامل ہیں۔ اس کے بعد "تعلیم و تربیت"، "عورت"، "ادبیات" اور "سیاسیاتِ مشرق و مغرب" کے مستقل عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ہر عنوان کے تحت متعلقہ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مختصر نظمیں درج ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں "محراب گل افغان کے افکار" کے زیرِ عنوان ایک فرضی کردار کی زبان سے نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ محراب گل افغان کے ذریعے اقبال نے سرحدی اور قبائلی علاقوں کے مسلمانوں کی غیرت، سادگی، آزادی پسندی اور انقلابی امکانات کو آواز دی ہے۔

اختصار اور براہِ راست اسلوب

ضربِ کلیم کی بیشتر نظمیں نہایت مختصر ہیں۔ اکثر نظمیں دو، تین یا چار اشعار سے زیادہ نہیں۔ یہ نظمیں حشو و زوائد سے پاک ہیں اور ان میں خیالات کو براہِ راست، واضح اور پُر زور الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

موضوعات کی سنجیدگی اور فکری گہرائی کے باوجود ان نظموں کی شعریت متاثر نہیں ہوتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان میں جذبہ ایک زندہ آگ کی طرح رواں ہے جو قاری کے احساسات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اقبال کی عمر بھر کی شاعرانہ مہارت، فلسفیانہ مطالعے، تاریخی بصیرت اور تہذیبی تجربے کا نچوڑ اس کتاب میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اپنا بنیادی نظامِ فکر اس سے پہلے پیش کر چکے تھے، لیکن ضربِ کلیم کی بعض نظمیں اتنی واضح، جامع اور فیصلہ کن ہیں کہ انہوں نے اقبال کے افکار کے متعلق متعدد غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔

اسی لیے اقبال کے نظریات کی توضیح کے لیے ضربِ کلیم کے اشعار کو کثرت سے سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بالخصوص اقبال کے نظریۂ فن کے بارے میں جو واضح تصورات اس مجموعے میں ملتے ہیں، وہ اس جامع صورت میں ان کے دوسرے مجموعوں میں موجود نہیں۔

غلامی، بے عملی اور تقدیر

ضربِ کلیم میں مسلمانوں کی بے عملی، غلط تصورِ تقدیر اور مغربی فلسفوں کے تباہ کن اثرات کو بار بار موضوع بنایا گیا ہے۔ نظم ''تن بہ تقدیر'' میں اقبال نے اس ذہنی غلامی کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا ہے:

''تن بہ تقدیر''

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[۲۲]

مسلمانوں کی بے عملی، تحریف شدہ مذہبی تصورات اور مغربی افکار کے ہلاکت آفرین اثرات کے متعلق اقبال نے اس سے پہلے جو کچھ مختلف مقامات پر بیان کیا تھا، وہ اس قطعے میں نہایت جامع اور موَثر صورت میں سامنے آ گیا ہے۔

ضربِ کلیم کی متعدد نظموں کا مرکزی خیال یہی ہے کہ زندگی حرکت، کشمکش اور تخلیقی عمل کا نام ہے، جب کہ جدوجہد سے فرار حقیقی شکست ہے:

گریز کشمکشِ زندگی سے، مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست[۲۳]

ضربِ کلیم کا فنی مقام

ضربِ کلیم کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

فن شاعری کا جو کمال بالِ جبریل کی نظموں میں وسیع پیمانے پر ظاہر ہوا ہے اس کے نمونے ضربِ کلیم میں چھوٹے پیمانے پر نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ اب شاعر کا تخیل پیکر تراشی سے زیادہ نکتہ سنجی کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ ضربِ کلیم نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل پانچ غزلیں ہیں۔[۲۴]

اس رائے سے واضح ہوتا ہے کہ بالِ جبریل میں اقبال کا تخیل وسیع شعری پیکروں، علامتوں اور طویل نظموں کی صورت میں سامنے آتا ہے، جب کہ ضربِ کلیم میں وہی فکری قوت مختصر، نکتہ آفریں اور براہِ راست نظموں میں سمٹ جاتی ہے۔

شاعر کا پیغمبرانہ اور اصلاحی کردار

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، ضربِ کلیم میں شاعر اپنے عہد کے فراعنہ کے مقابل حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے کردار کی علامتی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہاں شاعر محض حسن و جمال کا بیان کرنے والا فن کار نہیں بلکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرنے والا، باطل نظاموں کو چیلنج کرنے والا اور قوم کو بیدار کرنے والا مصلح دکھائی دیتا ہے۔

اسی لیے ضربِ کلیم کی شاعری اقبال کی بلند آہنگ، پیغام آفریں اور واضح اسلامی شاعری ہے:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ[۲۵]

تو معنیٰ و النجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جذر بھی چاند کا محتاج[۲۶]

ان اشعار میں اقبال نے حق گوئی، توحید، کائناتی شعور اور انسان کی روحانی وابستگی کو نمایاں کیا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی درد

ضربِ کلیم میں اقبال صرف ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر اظہارِ خیال نہیں کرتے بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کے غم خوار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل مقامی نہیں بلکہ عالمی نوعیت کے ہیں:

غدار وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر[۲۷]

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور[۲۸]

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان[۲۹]

یہاں اسلام کو محض ایک مذہبی شناخت کے بجائے فقرِ غیور، آزادی، خودداری، کردار اور خدا کی زندہ برہان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

عورت اور نظامِ تعلیم

ضربِ کلیم میں اقبال نے عورتوں، ان کی تعلیم، معاشرتی کردار اور جدید تہذیب کے اثرات کے متعلق بھی اپنے نظریات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس موضوع کی طرف ان کی خصوصی توجہ کو دورۂ مدراس کے دوران انجمنِ خواتینِ اسلام کی جانب سے پیش کیے گئے بعض تحفظات اور شکایات کا نتیجہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔

اقبال ایسی تعلیم کے مخالف ہیں جو عورت کو اس کی نسوانی خصوصیات، خاندانی ذمہ داریوں، اخلاقی عظمت اور فطری وقار سے محروم کر دے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت[۳۰]

اس شعر میں اقبال علم کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ ایسے نظامِ تعلیم پر تنقید کرتے ہیں جو انسان کی فطری، اخلاقی اور روحانی شخصیت کو مسخ کر دے۔

انقلابی فکر

ضربِ کلیم میں اقبال کے انقلابی تصورات بھی پوری قوت سے سامنے آتے ہیں۔ وہ مشرق کے روحانی سرمائے، نئی فکری بیداری اور قدیم استحصالی نظام کے خاتمے کی نوید دیتے ہیں:

رکھتا ہے اب تک میخانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک[۳۱]

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہان پیر کی موت[۳۲]

ان اشعار میں ''جہانِ پیر'' فرسودہ، استحصالی اور غیر منصفانہ نظام کی علامت ہے، جب کہ ''ولولۂ انقلاب'' ایک نئے اور عادلانہ انسانی نظام کی امید کی ترجمانی کرتا ہے۔

ارمغانِ حجاز

اشاعت اور مجموعے کی نوعیت

ارمغانِ حجاز علامہ اقبال کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا زیادہ حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے، تاہم اس میں اردو شاعری کا ایک مستقل حصہ بھی شامل ہے۔ یہاں اسی اردو حصے کا جائزہ مقصود ہے۔

ارمغانِ حجاز کو اقبال کے بہترین شعری مجموعوں میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں شامل نظمیں اور رباعیات ان کی زندگی کے آخری ایام کی تخلیقات ہیں۔ اس وقت تک ان کے افکار پوری طرح پختہ اور ان کا شعری اسلوب اپنی انتہائی جامع صورت اختیار کر چکا تھا۔

اردو حصے کی اہم تخلیقات

ارمغانِ حجاز کے اردو حصے میں اقبال کی مشہور طویل نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' شامل ہے۔ مجموعے کے آخر میں ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے عنوان سے چند نظمیں اور قطعات درج ہیں جن میں اہلِ کشمیر کی پستی، غلامی اور بے عملی پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔

''محراب گل افغان'' کی طرح ''ملازادہ ضیغم لولابی'' بھی ایک فرضی شخصیت ہے۔ مختلف علاقوں سے اس نوع کے فرضی کردار تخلیق کر کے اقبال یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عالمِ اسلام کے ہر خطے کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور وہ عمل، آزادی اور احیائے ملت کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔

رباعیات اور شعری ہیئتوں کا تنوع

ارمغانِ حجاز میں حکمت و دانش سے بھرپور تیرہ رباعیات شامل ہیں۔ اقبال نے اردو شاعری کی تقریباً ہر اہم صنف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنی انفرادیت کے واضح نقوش قائم کیے۔

رباعی مختصر ہونے کے باوجود ایک نہایت مؤثر، جامع اور خوب صورت شعری ہیئت ہے۔ قطعہ مختصر بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی، تاہم اقبال کے بیشتر قطعات اختصار کے حامل ہیں۔

جن خیالات کو وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے طویل اور مختصر جدید نظموں، مسمط کی مختلف صورتوں، مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند، مثنوی اور غزل کی ہیئتیں اختیار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے مختصر قطعات بھی معنوی اعتبار سے اتنے ہی بھرپور ہوتے ہیں جتنی ان کی رباعیات۔ ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' میں شامل بیشتر اشعار قطعات ہی کی نوعیت رکھتے ہیں۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس اور اس کے پانچ مشیر مختلف سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ اپنی ساخت کے اعتبار سے یہ نظم انگریزی شاعر ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) کے ابتدائی باب میں منعقد ہونے والی مجلسِ شیاطین سے مماثلت رکھتی ہے۔

دونوں مقامات پر ابلیس اور اس کے مشیروں کی مجلس برپا ہوتی ہے، تاہم دونوں نظموں کے بنیادی مقاصد میں فرق ہے۔ اقبال کی نظم میں جدید سرمایہ دارانہ، استعماری اور لادینی نظام کی بقا کے طریقے زیرِ بحث آتے ہیں اور ابلیسی نظام کو سب سے بڑا خطرہ اسلام کی انقلابی اور عادلانہ تعلیمات سے محسوس ہوتا ہے۔

اقبال کی نظر میں ابلیسیت، سرمایہ داری، ملوکیت، استحصال اور اخلاقی زوال کی تمام تدابیر کا حقیقی توڑ اسلام ہی پیش کرتا ہے:

جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے![۳۳]

اس شعر میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ مستقبل کے باطل نظاموں کے لیے اصل خطرہ محض کسی مادی معاشی نظریے سے نہیں بلکہ اسلام کی اس انقلابی روح سے ہے جو عدل، اخوت، مساوات، آزادی اور انسانی وقار کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ارمغانِ حجاز کی ایک اہم نظم "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" ہے۔ اس نظم میں نوجوانوں کو غیرت، جرأت، خودداری اور جدوجہد کی تعلیم دی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اقوام کی تقدیر ان کے افراد کے کردار، عزم اور عمل سے تشکیل پاتی ہے:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا[۳۴]

ان اشعار میں اقبال نے فرد اور ملت کے باہمی تعلق کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ ملت کا مستقبل کسی خارجی معجزے سے نہیں بلکہ اس کے افراد کی غیرت، کردار اور عملی صلاحیت سے وابستہ ہوتا ہے۔

مکالماتی اور علامتی نظمیں

ارمغانِ حجاز میں ایک مختصر نظم میں تصویر اور مصور کے درمیان مکالمہ قائم کیا گیا ہے، جب کہ "عالم برزخ" میں قبر اور مردے کو گفتگو کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس مکالماتی اسلوب کے ذریعے اقبال مجرد فلسفیانہ اور روحانی مسائل کو زندہ شعری صورت عطا کرتے ہیں۔

مجموعے میں ''معزول شہنشاہ'' کے عنوان سے ایک نظم، ''مسعود مرحوم'' کے نام ایک نظم اور سر اکبر حیدری، صدر حیدر آباد دکن، کے نام ایک نظم بھی شامل ہے۔ ''حسین احمد'' کے عنوان سے ایک قطعہ درج ہے جس میں دین اور وطن کے تعلق کی بحث سامنے آتی ہے۔ مجموعے کے آخر میں ''حضرتِ انسان'' کے عنوان سے انسانی عظمت، صلاحیت اور کائناتی مقام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارمغانِ حجاز: فکر و جذبے کا خلاصہ

ارمغانِ حجاز کے فکری عوامل اور موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ اسے اقبال کے دورِ پختہ کاری کا شاہکار قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ مجموعہ اقبال کی وفات کے چھ سات ماہ بعد شائع ہوا اور اس میں شاعر نے گویا اپنے گزشتہ تمام کلام پر ایک آخری نگاہ ڈالی ہے۔[۳۵]

یہاں پہنچ کر اقبال اپنے پورے فکری اور شعری سفر کا جائزہ لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز ان کے سابقہ افکار کا محض اعادہ نہیں بلکہ ان خیالات کا نچوڑ اور جذبات کا خلاصہ ہے۔ اس میں پختگی، اختصار اور معنوی گہرائی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ گویا یہ ایک ایسا کوزہ ہے جس میں دریائے معانی کو سمو دیا گیا ہو۔

اقبال کی اردو شاعری کا مجموعی جائزہ

اقبال کے چاروں اردو شعری مجموعوں کا بحیثیتِ مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری بنیادی طور پر حرکت، عمل، جدوجہد اور تخلیقی زندگی کی شاعری ہے۔ وہ جمود، بے عملی، غلامی، مایوسی اور تقدیر پرستی کو فرد اور قوم دونوں کے لیے تباہ کن قرار دیتے ہیں۔

اقبال کا کلام اسلام اور قرآن کی طرف از سرِ نو رجوع کی دعوت دیتا ہے۔ تاہم یہ رجوع ماضی کی محض تقلید نہیں بلکہ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں جدید زندگی کی تعمیر کا مطالبہ ہے۔ ان کے نزدیک انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ اس منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کرے، کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے، عدل قائم کرے اور اخلاقی و روحانی اقدار کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی تشکیل کرے۔

اقبال کو مختلف اقوام، تہذیبوں اور شخصیات میں جہاں کہیں حرکت، عزم، قوتِ ارادی اور ندرتِ فکر و عمل دکھائی دیتی ہے، وہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ اٹلی کے آمر

مسولینی پر نظم لکھتے ہیں تو اس کا سبب اس کے پورے سیاسی نظام کی تائید نہیں بلکہ اقبال کی جانب سے قوتِ عمل، جرأت اور غیر معمولی ارادے کی اہمیت کا اعتراف ہے۔

اقبال کی شاعری میں ندرتِ فکر بھی ہے اور ندرتِ عمل بھی۔ ان کے ہاں فکر محض نظری یا مجرد سرگرمی نہیں بلکہ عمل کی بنیاد ہے، جب کہ عمل کسی اندھی قوت کا نام نہیں بلکہ ایک بلند مقصد، اخلاقی شعور اور روحانی بصیرت کے تابع ہے۔

بانگِ درا میں اقبال کے فکری سفر کا آغاز اور تدریجی ارتقا نظر آتا ہے۔ بالِ جبریل میں ان کی فکر، فن اور شعری زبان اپنی بلند ترین جمالیاتی سطح پر پہنچتی ہے۔ ضربِ کلیم میں یہی فکر براہِ راست، مختصر، انقلابی اور تنقیدی اسلوب اختیار کرتی ہے، جب کہ ارمغانِ حجاز میں ان کے تمام فکری و جذباتی تجربات ایک جامع، پختہ اور عارفانہ صورت میں سمٹ آتے ہیں۔

اس طرح اقبال کی اردو شاعری فرد کی تعمیر، ملت کی بیداری، اسلامی تہذیب کے احیا، مغربی مادیت کی تنقید، انسان کے روحانی مقام کی تعیین اور ایک عادلانہ عالمی نظام کی تشکیل کا ہمہ گیر شعری منشور بن جاتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱ کلوروی، ڈاکٹر صابر، کلیات باقیات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان لاہور

۲ ایضاً

۳ گیان چند، ڈاکٹر، ابتدائی کلامِ اقبال، اُردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد انڈیا، ۱۹۸۸ء، ص۷۸

۴ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص۷۸

۵ ایضاً، ص۸۱

۶ ایضاً، ص۱۶۰

۷ ایضاً، ص۱۵۸

۸ ایضاً، ص۱۵۰

۹ ایضاً، ص۱۵۶

۱۰ ایضاً، ص۲۱۲

۱۱ ایضاً، ص۲۷۸

۱۲ ایضاً، ص۳۱۴

۱۳ ایضاً، ص۱۶۷

۱۴ ایضاً، ص۲۲۲

۱۵ ایضاً، ص۳۵۲

۱۶ ایضاً، ص۳۵۴

۱۷ ایضاً، ص۳۵۷

۱۸ ایضاً، ص۳۵۹

۱۹ ایضاً، ص۳۶۹

۲۰ ایضاً، ص۳۸۱

۲۱ ایضاً، ص۳۷۶

۲۲ ایضاً، ص۵۲۸

۲۳ ایضاً، ص۵۵۲

۲۴ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظام فن، طبع اول، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۷۷

۲۵ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۵۲۸

۲۶ ایضاً، ص۵۲۹

۲۷ ایضاً، ص۵۳۸

۲۸ ایضاً، ص۵۴۳

۲۹ ایضاً، ص۵۷۳

۳۰ ایضاً، ص۶۰۸

۳۱ ایضاً، ص۶۲۵

۳۲ ایضاً، ص۶۴۹

۳۳ ایضاً، ص۷۰۹

۳۴ ایضاً، ص۷۱۳

۳۵ ایڈوکیٹ، شیخ اکبر علی، اقبال اور اس کی شاعری، کمال پبلشرز نمبر ۲۶ مال روڈ لاہور، س ن، ص۴۰